علامہ اقبال اور خواجہ غلام فرید کے متصوفانہ نظریات کا تقابلی مطالعہ

A comparative study of the mystical views of Allama Iqbal and Khawaja Ghulam Farid

ضیاء اللہ [i] ڈاکٹر راشدہ قاضی [ii]

Abstract:

This article explores the intertwined philosophical and mystical conceptions of God, love, destiny, death, and the human soul through the poetic legacies of two towering figures of South Asian thought: Allama Iqbal (1877–1938) and Khawaja Ghulam Farid (1845–1901). By juxtaposing Iqbal's philosophical poetry, largely written in Persian and Urdu, with Farid's mystical verse composed in Saraiki, the article highlights the resonance and divergence in their approaches to metaphysical realities. Both poets engage in an intellectual and spiritual dialogue with the Divine, but while Iqbal frames his vision in terms of the reconstruction of religious thought and the awakening of human selfhood (khudi), Farid emphasizes experiential mysticism, love (ishq), and surrender before the Beloved.

Keywords: *Allama Iqbal, Khawaja Ghulam Farid, South Asia, philosophical, mystical, Divine, selfhood, Poetry, Pakistani Literature.*

یہ مقالہ جنوبی ایشیائی فکر کی دو عظیم شخصیتوں علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸) اور خواجہ غلام فرید (۱۸۴۵-۱۹۰۱) کی شاعرانہ میراث کے ذریعے خدا ، محبت ، تقدیر ، موت اور انسانی روح کے آپس میں جڑے ہوئے فلسفیانہ اور صوفیانہ تصورات کی کھوج پر مشتمل ہے۔ اقبال کی فلسفیانہ شاعری ، جو زیادہ تر فارسی اور اردو میں لکھی گئی ہے ، فرید کی سرائیکی میں تصنیف کردہ صوفیانہ کلام کے ساتھ جوڑ کر ، مقالہ مابعد الطبیعیاتی حقیقتوں کی طرف ان کے نقطہ نظر میں گونج اور انحراف کو نمایاں کرتا ہے۔ دونوں شاعر الہٰی کے ساتھ فکری اور روحانی مکالمے میں مشغول ہیں ، لیکن جہاں اقبال مذہبی فکر کی تعمیر نو اور انسانی خودی کی بیداری کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر وضع کرتے ہیں ، وہیں فرید نے تجرباتی تصوف ، عشق اور محبوب کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر زور دیا ہے۔

کلیدی الفاظ: علامہ اقبال ، خواجہ غلام فرید ، جنوبی ایشیا ، فلسفیانہ ، تصوف ، روحانی ، شاعری ، خودی۔

علامہ اقبال (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۳۸ء) اور خواجہ غلام فرید (۱۸۴۵ء۔ ۱۹۰۱ء) ہم عصر شاعر ہیں اور دونوں کی فکری ہم آہنگی کے مآخذ عشق کے بحرِ ذخار سے ہیں۔ عشق ہی ان کے تخلیقی سفر کا زادِ راہ ہے۔ علامہ اقبال، خواجہ غلام فرید کے کلام سے بہت متاثر تھے، اور دونوں کا مذہب، ملت، مشرب ایک ہی تھا۔ عشق میں سوز و ساز، درد و داغ اور جستجو حقیقت مطلق دونوں میں یکساں ہیں۔ دونوں میں عشق، حقیقت، عشق رسول بہ درجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ ان کو عشق کے جلوے ہر ہر جا دکھائی دیتے ہیں۔ خواجہ غلام فرید کا عشق روہی چولستان کا عشق ہے، ان کے کلام میں عشق عزم و استقلال اور مزاج کی پختگی سے علم و عمل کی اعلیٰ اقدار سے وحدت الوجود کے سائے میں پنپتا ہے۔ روہی کے عشق کے حوالے سے خواجہ غلام فرید کی کافی ۶۸ کا ایک بیت

[i] سکالر پی ایچ۔ڈی ، شعبہ اردو ، غازی یونی ورسٹی ، ڈیرہ غازی خان۔

[ii] صدر نشین ، شعبہ اردو ، غازی یونی ورسٹی ، ڈیرہ غازی خان (Corresponding Author)

ضرب المثل بن چکا ہے:

تھل مارو دا پینڈا سارا
تھیسم ہک بلھانگ[1]

(جذبۂ عشق کی شدت سے میں سارے ریگستان کو میں ایک ہی جست میں طے کر لوں گا۔)

بالکل اسی موضوع پہ علامہ اقبال نے کہا ہے:

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں[2]

ایک اور مقام پہ علامہ اقبال زبورِ عجم میں کہتے ہیں:

وادئ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ سالہ با آہے گاہے[3]

اسی خیال کو خواجہ غلام فرید یوں بیان کرتے ہیں:

پاروں ڈسدی جھوک سجنڑں دی
کیوں رہساں اُروار[4]

(دریا پار سے محبوب کی بستی نظر آ رہی ہے تو پھر یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ میں اِس پار رک جاؤں۔)

علامہ اقبال کی طرح خواجہ غلام فرید کے نظریۂ عشق میں جذبۂ صداقت اور توفیق روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ کیوں کہ علامہ اقبال وادئ عشق کو روحانی واردات کی بدولت ایک ہی سانس میں عبور کرنے کا عزم رکھتے ہیں اور خواجہ غلام فرید ہمت اور ارادے کی پختگی سے دریا حائل ہونے والے مصائب کو عاشق صادق کے جذب دروں سے پار کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ یہاں بھی اشتراک کی عمدہ مثال ہے کہ دونوں کا محبوب حقیقی عیاں ہے۔ اقبال دور دراز وادی میں دیکھ رہے ہیں اور خواجہ غلام فرید دریا پار بستی میں۔ اقبال کے ہاں فاصلۂ دور و دراز حائل ہے اور فرید کے ہاں دریا حائل ہے۔ اقبال اس فاصلے کو صوفیانہ واردات سے طے کر رہے ہیں اور سو سالہ سفر کو آنِ واحد میں طے کر رہے ہیں، جب کہ خواجہ غلام فرید عزم و ہمت اور ارادے کی پختگی سے عبور کر رہے ہیں۔ دونوں کا فکری اشتراک عشق کی طاقت اور شان ہے جو زمان و مکان سے ارفع ہے۔ اقبال کی ایک جست غیر معمولی قوت روحانی جو زمین و آسمان کو طے کر رہی ہے

اور خواجہ غلام فرید کی ایک بلہانگ (چھلانگ) سے آنکھ جھپکنے میں روحانی اڑان سے طے کر رہے ہیں۔ دونوں کے عشق کی روحانی پرواز محبوب مطلق تک رسائی کی وجہ بنتی ہے۔ دونوں صوفیانہ نظریات میں اس حد تک متفق ہیں، ان کے عشق کے مرکزی نقطے کی بدولت ان کی منزل مقصود میں حائل صعوبتیں چہ معنی دارد؟ اقبال اور خواجہ غلام فرید خالق و مخلوق میں حائل پردوں سے ہمیشہ نالاں ہیں۔ اسی لیے ایک جست میں یہ بُعد اور قرب میں بدلنے کے خواہاں ہیں۔

علامہ اقبال اور خواجہ غلام فرید ایسے شاعر تھے، جن کے صوفیانہ تجربات کے ہندستان کی سرزمین پر بہت اثرات مرتب ہوئے۔ مذہبی روایتی تعلیمات کے علاوہ عربی و فارسی میں جتنے علوم اُس وقت تک ترجمہ ہو چکے تھے، وہ سبھی خواجہ غلام فرید کے علم میں تھے۔ علامہ اقبال بھی عربی و فارسی تعلیمات کے بعد بین الاقوامی جامعات سے مابعدالطبیعات اور فلسفہ کی تعلیمات سے بہرہ ور ہو کر واپس آ چکے تھے۔ ان دونوں کے متصوفانہ نظریات انتہائی مطابقت رکھتے تھے۔ خواجہ غلام فرید نے اپنا سارا کلام صیغۂ تانیث میں پیش کیا ہے، وہ کبھی سسی، کبھی سوہنی، کبھی سومل اور مومل کی زبان سے یومِ الست کے داغِ مفارقت کاالم نظریۂ غم کی معراج تک پہنچانے والے شاعر ہیں۔ وہ شرابِ ازل کو خمار آلود اور سکر آمیز متصوفانہ نظریات میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ عبادات کو خود پر ساقط قرار دیتے ہیں۔ کیوں کہ یہ شرعی حکم ہے کہ حالتِ سکر میں عبادات لاگو نہیں ہوتیں، بس اسی خیال سے صوفیانہ نظریات کو منجمد اور انفعال پذیر قرار دیا گیا۔ جیسے خواجہ غلام فرید کہتے ہیں:

عاری پھر دے حج زکاتوں — صوم صلاتوں ذات صفاتوں
رند الَستوں ہِن مخمور[۵]

اس رندانہ خمار سے روایتی صوفی میں جہدِ مسلسل اور تگاہ پوئے دمادم نہیں پائے جاتے۔ علامہ اقبال اسی صوفیانہ تصور کو یعنی شراب الست کو اپنی شاعری میں صوفیوں کی بہانہ جوئی سے عبارت کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست[۶]

علامہ اقبال کے نزدیک مروجہ نظریات کا حامل تصوف بے عمل و مضمحل ہوتا ہے۔ زندگی کی دوڑ

میں پیچھے رہ جانے والا ہوتا ہے۔ اقبال اس طرح کے تصوف کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ علامہ اقبال اور خواجہ غلام فرید کے تصوف میں صرف اور صرف یہی واضح افتراق ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں وحدت الوجودی نظریات کے اختلاف کے علاوہ باقی بہت حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔ عمومی تاثر یہ ہے کہ صوفی ایک مصلحت آمیز، صلح جو، منکسر المزاج اور گوشہ نشین ہوتے ہیں، جنھیں اقبال ''گوسفند سلیم'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ جب کہ خواجہ غلام فرید بنیادی طور پر خانقاہی متصوفانہ مزاج کے حامل ہونے کے باوجود اسے جان جان جوکھوں کا کام کہتے ہیں:

ہے فقر فقط جاں بازی[۷]

اس تناظر میں خواجہ غلام فرید کا فقر علامہ اقبال کے فقر کی طرح فقرِ غیور ہے نہ کہ فقرِ مخمور ہے۔ خواجہ غلام فرید کے کم و بیش تیرہ (۱۳) والیانِ ریاست مرید تھے۔ خواجہ فرید پیر ہونے کے ناتے اُن کو مشورے بھی دیتے تھے اور غلطیوں کی نشان دہی بھی کرتے تھے۔ خواجہ غلام فرید کے سب سے قریبی مرید نواب آف بہاول پور صادق خان عباسی نے ایک دیوبندی عالم کو اپنے مسلک کی تبلیغ کرنے اور بزرگانِ دین کے خلاف تقاریر کرنے پر ریاست بدر کر دیا۔ مولوی صاحب خواجہ غلام فرید کے پاس چلے گئے اور اپنی مشکل بیان کی۔ خواجہ فرید نے نواب آف بہاول پور کے نام خط لکھا، جو ایک معرکتہ الآرا خط کے طور پر مشہور ہے اور ضرب المثل بن چکا ہے۔ خواجہ غلام فرید نے خط میں لکھا کہ:۔

صادق زیر تھی، زبر نہ بنڑ، متاں پیش پووی[۸]

جس کی علامتی زبان سے شرح صدر یہ ہوتا ہے کہ عوام الناس پر رحم کرو، ظلم نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت والے دن یہ مظالم تمھارے گلے پڑ جائیں۔ ظاہر ہے کہ اگر مذہبی پیشوا اسی طرح اپنا دبدبہ اپنے معتقدین پر اصلاح کے لیے قائم رکھیں، چاہے وہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہوں، تو معاشرے میں طبقاتی ناہمواریوں اور مظالم سے چھٹکارا ملتا رہے گا۔

بالکل اسی طرح کا ایک واقعہ علامہ اقبال بھی اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں:

بازگیر اے عامل بد گوہرے
ورنہ بخشم ملک تو با دیگرے[۹]

(خبر دار اے حاکم اپنے بد فطرت عامل کو واپس بلا لے، ورنہ تمھارا ملک ہم کسی اور کو سونپ دیں گے۔)

یہ وہ خط ہے، جو بو علی قلندر نے اپنے عقیدت مند فرماں روا، علاؤالدین خلجی کو لکھا، جن کے مقرر کردہ عامل نے بو علی قلندر کے خلیفہ کو سر میں ڈنڈا مار کر زخمی کر دیا تھا، جس پر بو علی قلندر نے مصلحت آمیز رویہ اختیار نہیں کیا، بلکہ ایک مزاحم کے طور پر اپنے عقیدت مند کو ایسا مراسلہ جاری کیا جس میں کسی قسم کے منصب کو ملحوظِ خاطر نہ رکھا بلکہ ملک چھن جانے کی خبر دے دی۔ یوں علامہ اقبال اور خواجہ غلام فرید کے بیدار تصوف کی اعلیٰ اور عملی مثالوں سے اشتراک نظر آتا ہے۔

علامہ اقبال اور خواجہ غلام فرید مُلّا کی عاقبت نااندیشی پر اور اس کے 'فی سبیل اللہ فساد' پر بھی متفق ہیں کہ وہ مذہبی تعلیمات کو اپنی پسندیدگی سے استعمال کرتا ہے۔ خواجہ غلام فرید کہتے ہیں:

مُلّا نہیں کہیں کار دے   شیوے نہ جاݨن یار دے
سمجھن نہ بھیت اسرار دے   ونج کنڈ دے بھرڑیں تھئے وڑیں"[۱]

(یہ ملا بیکار ہیں، کیوں کہ یہ ہے اسرارِ الٰہی سے اور شریعت سے نابلد ہیں، اسی لیے شکست خوردہ ہیں۔)

جب کہ علامہ اقبال نے تو "دین ملا فی سبیل اللہ فساد" کہہ کر ایک مصرعے میں ہی ملائیت کی توضیح کر کے رکھ دی ہے۔

علامہ اقبال کے ابتدائی کلام میں وجودی اثرات کے شواہد ملتے ہیں، جو خواجہ غلام فرید کی وجودی فکر اور کلام سے بہت حد تک مماثل ہیں۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

ما ہمہ یک دودمان نار و نور
آدم و مہر و مہ و جبریل و حور"

(انسان، چاند، سورج، جبرائیل اور حور، ہم سبھی ایک ہی خاندانِ آگ اور نور سے ہیں۔)

اس شعر میں علامہ اقبال کا اس جہان کی مثلث یعنی انسان، کائنات اور ایمان بالغیب (جبریل و حور مہر و مہ) کو ایک ہی خاندان سے کہنا وہی وجودی فکر ہے جو خواجہ غلام فرید کی ہے۔ یہی فکر خواجہ غلام فرید نے علامہ اقبال سے کم و بیش تیس سال پہلے یوں منظوم کی تھی:

رکھ تصدیق نہ تھی آوارہ   کعبہ، قبلہ، دیر، دوارہ
مسجد، مندر، ہکڑو نور"[۲]

(جستجوئے حقیقتِ مطلق میں متذبذب نہ ہو، کعبہ، قبلہ، مسجد، مندر، دیر، دوارہ ایک ہی نور سے ہیں۔)

خواجہ غلام فرید تصوف کے بارے میں وحدت الوجود کی بنا پر حقیقتِ مطلق کے مظاہرات پر ایمان رکھتے ہیں، اور کائنات کے ہر مظہر کو عرفانِ ذات سے آگاہی کا سبب جانتے ہے۔ خواجہ غلام فرید نے یہ پیچیدہ مضمون فلسفہ کے بجائے عام فہم اور سادہ اسلوب میں بیان کیا ہے، جو علامہ اقبال اور خواجہ غلام فرید کے مذکورہ بالا اشعار میں یکسر موجود ہے۔ علامہ اقبال، خواجہ غلام فرید کے کلام سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ ان کے علم اور عرفان کو من و عن تسلیم کرتے ہیں، یہاں تک کہ اذکار و افکار کے بھی بعینہٖ بیان کرتے ہیں۔ یوں کہیں تو علامہ اقبال کی تعلیمات اور عرفان و آگہی کا سفر خواجہ غلام فرید کی معرفتِ حق کا باہم اشتراک ہیں۔ خواجہ غلام فرید کی کافی نمبر ۱۳۲ سے یہ قطعہ دیکھیں:۔

میڈی زہد عبادت طاعت تقویٰ علم وی توں عرفان وی توں
میڈا ذکر وی توں میڈا فکر وی توں میڈا ذوق وی توں وجدان وی توں [۱۳]

اسی خیال کو علامہ اقبال نے تفریس کرکے یوں پیش کر دیا ہے:

ذکر و فکر و علم و عرفان توئی [۱۴]

علامہ اقبال کے متصوفانہ نظریات عشق، عمل، حرکت، جہدِ مسلسل اور سلوک کی منازل پر منحصر ہے۔ اگر تصوف ان اوصاف سے عاری ہے تو اقبال اس تصوف سے انکاری ہے۔ اگرچہ اقبال وحدت الوجود کے نظریے کو من و عن تسلیم نہیں کرتے، مگر فلسفیانہ حد تک کچھ اس لیے مانتے ہیں کہ وہ ترکِ عمل کی طرف راغب نہ ہو۔ علامہ اقبال تقدیر کے مسئلے میں قدر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور جبریہ نظریے سے اجتناب کرتے ہیں۔ ایسے تصوف کو پسند کرتے ہیں جو سماجی اور فردی بے عملی کا موجب نہ بنے، فرد کی عملی زندگی میں فعال ہو، اور خودی کو تقویت دیتا ہو، فعال عشق سے مزین ہو، اجتماعی معاشرتی تعمیر کا خواہاں ہو اور اس تصوف سے بیزار ہیں جو حجرہ نشینی اور کنارہ کشی اور گریز پائے حیات ہو، ان کے نزدیک:۔

> تصوف نے جہاں انسان دوستی اور رواداری کو پروان چڑھایا ہے، وہاں بر صغیر کی مسلم اور غیر مسلم معاشرت میں امتزاج کی راہ بھی ہموار کی ہے، غیر مسلموں پر مسلم ثقافت کے اثرات پڑے تو مسلم معاشرت میں بھی بہت سی غیر مسلم مذہبی رسوم رچ بس گئیں۔ اس سے ایک طرح کی روایت ہی مسلم ثقافت ظہور پذیر ہوئی جو اٹھارویں صدی میں اپنے عروج پر تھی احیائے اسلام کی تحریکوں نے اس

روایتی مذہبی ثقافت کی اصلاح کے جذبے سے جنم لیا۔[۱۵]

جہاں تک خواجہ غلام فرید کے نظریۂ وحدت الوجود کا تعلق ہے تو وہ واضح طور پر وجودی اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے وحدت الوجود کو بیان کرتے ہیں، تاہم ان کے نزدیک نظریۂ عشق کی معراج یہ ہے کہ عاشق صادق ہر چیز میں محبوب حقیقی کا دیدار کرتا ہے۔ انسان اور خدا میں بُعد دراصل قرب ہے، جو محض فریبِ نظر ہے۔ خواجہ غلام فرید کہتے ہیں:

میڈا عشق وی توں میڈا یار وی توں
میڈا دین وی توں ایمان وی توں[۱۶]

خواجہ غلام فرید کا نظریۂ وحدت الوجود ان کے عشقِ الٰہی اور کائنات میں مظہر حقیقی کا علم بردار ہے۔ ان کے داخلی شواہد میں وجودِ حقیقی ایک زندہ حقیقت ہے۔ ان کے وحدت الوجودی تصور سے انسان، کائنات سب خدا کی جلوہ گری ہے اور دیوانِ فرید کا مرکزی خیال بھی وجودی ہی ہے۔ علامہ اقبال پیرِ رومی کے پیروکار ہونے کے باوجود اپنے وحدت الوجود کے نظریے کا مختلف اظہار کرتے ہیں، کیوں کہ ان کا مطمحِ نظر خودی اور ملت بیضا میں فعالیت کو زندہ رکھنا ہے۔ خودی خود مختار ہے، خودی باارادہ ہے، جس میں بقاء ہے، ارتقاء ہے۔ اقبال وحدت الوجود کے اس لیے ناقد ہیں کہ وہ فعالیت کو انفعالیت میں بدل دیتی ہے اور اقبال کا تصوف جبر میں نہیں بلکہ قدرت رکھنے والا ہے، فنا فی اللہ میں نہیں بلکہ بقاء باللہ کا قائل ہے، کائنات کو مسخر کرنے والا ہے نہ کہ کائنات میں تحلیل ہونے والا ہے۔ اقبال کا تصوف انفرادیت کو قائم رہنے دیتا ہے، خدا اور بندے کا امتیاز ملحوظِ خاطر رکھتا ہے، حالاں کہ وحدت الوجود میں سب کچھ خدا ہے، اس کا تصورِ اخلاق، اقدار اور جہدِ مسلسل اور فرد کے آزادی کو مسخ کر دینے والا ہے۔ اقبال کے نزدیک عرفانِ الٰہی خودی کے ارتقاء سے حاصل ہوتا ہے، بندہ عبد ضرور ہے مگر خلیفۃ الارض ہے، عبدہ ہے۔ چاہے اقبال وحدت الوجود کے اس طرح قائل نہیں ہیں لیکن وہ قربِ الٰہی اور صوفیانہ واردات کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک صوفی کو عرفان کے درجات پر خالق کی جلوہ گری محسوس ہوتی ہے۔

علامہ اقبال کے متصوفانہ نظریات کے مطابق وجودِ حقیقی مستقل اور اعلیٰ ہے۔ کائنات مخلوق ہے اور خدا کی منشاء سے قائم ہے، اور انسان خدا کا بندہ اور نائب ہے۔ جب کہ خواجہ غلام فرید فناء فی اللہ کے قائل ہیں کہ انسان اپنی ہستی مٹا دیتا ہے۔ علامہ اقبال بقاء باللہ کے قائل ہیں، کہ انسان خدا سے جڑ کر ترقی کرتا ہے۔

فناء اور بقاء کے حوالے سے ابوالقاسم قشیری کہتے ہیں:

صوفیا کے یہاں فناء سے مراد مذموم اوصاف کا ساقط ہو جانا ہے اور بقاء سے مراد اوصافِ حمیدہ کا بندہ کے ساتھ قائم ہونا ہے۔ انسان میں ان دونوں میں سے ایک صفت ضرور باقی رہتی ہے، ایک کی نفی ہو جانے سے لامحالہ دوسری کا اثبات ہو جاتا ہے۔[۱۷]

اس حوالے سے دیکھیں تو علامہ اقبال اور خواجہ فرید؛ دونوں کا مرکز خدا ہے، دونوں عشق کو عرفان سمجھتے ہیں، دونوں عقل سے زیادہ دل کی حکمرانی پر زور دیتے ہیں۔ دونوں میں یہ تضاد درجۂ ادراک کے فرق سے ظاہر ہوتا ہے۔ علامہ اقبال خواجہ غلام فرید سے عشق، تلاشِ حق اور روحانیت میں ہم آہنگ ہیں۔ عشقِ فرید فناء میں لذت محسوس کرتا ہے جب کہ اقبال کا عشق بقاء میں لذت تلاش کرتا ہے۔ دیوانِ فرید عدم سے فناء میں لے جاتا ہے، جب کہ اقبال کی شاعری میں نیستی سے خودی کے سالک راہِ سلوک میں مختلف راستوں سے آتے ہیں، لیکن ان کا ہدف عرفانِ الٰہی ہی ہوتا ہے۔ اقبال کے خیال میں وحدت الوجود انسان کو بے عمل اور مجہول و عاجز بنا دیتا ہے، جب کہ خواجہ غلام فرید اس نظریے پر اتفاق نہیں کرتے۔ یہی فکری ارتقاء کی خوب صورتی ہے۔ خواجہ غلام فرید نے عشق کا چراغ لیا ہے مگر ارادہ، عقل اور علم سے خودی کی شمع خود فروزاں کی ہے۔ یہاں اقبال خواجہ غلام فرید سے متفق ہیں مگر مقلد نہیں۔ اقبال اور خواجہ غلام فرید کی تعلیمات سے شمعِ انسان روشن ہوتی ہے مگر سوالات کے جوابات خود تلاش کرتے ہیں۔ یہ اختلاف دونوں میں بُعد نہیں بلکہ فکر کی گہرائی ہے جو عشق، فکر اور وجدان کی روشنی میں نیا زاویہ عطا کرتی ہے۔

تصوف کے غلط استعمال سے قناعت پسندی اور مصلحت کیشی کے نام پر بے عملی کو جگہ ملتی ہے۔ اقبال کے متصوفانہ نظریات میں صوفی دنیا سے کنارہ کش نہیں ہوتا بلکہ اسے سنوارنے میں فعال ہوتا ہے، کہ تصوف کا مطلب کارِ خیر کرنا ہے نہ کہ گوشہ نشین ہونا۔ یوں اقبال رہبانیت اور بے عملی کے تصوف کے خلاف تھے۔ انسان اللہ کی وحدانیت کا شاہد ہے اور اقبال کی تعلیمات کا اصل پیغام عشق اور خود شناسی ہے۔ وجود کائنات اللہ کی تجلی ہے، کائنات اللہ کی مخلوق ہے۔ علامہ اقبال عمل اور فعالیت پر مجدد الف ثانی کے پیروکار ہیں، کہ انھوں نے عشق میں روحانیت کو تو قبول کیا لیکن وحدت الوجود کے مابعد الطبیاتی پہلو سے متفق نہیں ہوئے۔ بلکہ خودی کی تربیت کر کے اللہ کا شاہد بننا چاہا، نہ کہ اپنی انفرادیت کو فنا کر دینا پسند کیا۔ اس کے مقابل خواجہ غلام فرید کے متصوفانہ نظریات کے ماخذات کا جائزہ لیا جائے تو عشق اور لافانی خودی جو سرچشمۂ عرفان

ہے، دل کی بے نیازی، رضائے الٰہی، قضائے الہٰی (تقدیر)، خودداری اور فناء فی اللہ ہے۔ فوائد فریدیہ میں خواجہ غلام فرید لکھتے ہیں:

> ہر صورت میں وہی ذات پاک جلوہ نما ہے، جو ہر مرتبہ میں مختلف نام رکھتی ہے۔ پس چاہیے کہ عبودیت کے مراتب کے اسماء کا اطلاق الوہیت کے مرتبہ پر نہیں کیا جانا چاہیے۔[۱۸]

علامہ اقبال کے متصوفانہ نظریات کے ماخذات خودی کی ارفعیت، فقر، غیور، مجاہدۂ نفس، مزاحمت اور بغاوت ہیں۔ علامہ اقبال کا فقر بیداریٔ ذات جب کہ خواجہ غلام فرید کا فقر قربِ الٰہی اور فنائے ذات ہے۔ خواجہ غلام فرید کا فقر مادیت سے بیزار اور اقبال کا فقر تسخیرِ شش جہات کا قائل ہے۔ خواجہ غلام فرید دنیا و مافیہا سے بے نیاز اور علامہ اقبال کا فقر جہدِ روزگار اور اقتدار ہے۔ فرید نامہ میں فیض احمد فیض کے حوالے سے لکھا ہے کہ خواجہ غلام فرید کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> خواجہ صاحب نے دیس سے محبت کی صحرا کی خوب صورتی کو باغ بخارا کی خوب صورتی پر ترجیح دی، خلق خدا سے محبت کی۔ میری خواجہ غلام فرید کی ذات اور شاعری دونوں سے نیاز مندی ہے۔[۱۹]

یہاں ایک مماثلت یہ ہے کہ اقبال و فرید؛ دونوں کے فقر میں روح کی آزادی بنیادی عنصر ہے۔ دونوں جسم کے غلامی سے بیزار ہیں، معاشرے کی اصلاح کے لیے مرد کو آزاد بنانے کی ترغیب کے قائل ہیں، دونوں کے مطابق فقر صرف عبادات پر منحصر نہیں بلکہ فعال فقر کے قائل ہیں۔ دونوں اسلامی فکر پر استوار اور جدید اجتہاد کی فکر کے حامل ہیں۔

علامہ اقبال کا سب سے اہم تعارف ان کا نظریۂ خودی ہے۔ خواجہ غلام فرید کے دیوانِ فرید میں علامہ اقبال سے کم و بیش ۳۰ سال پہلے بارہا نظریۂ خودی کا برملا اظہار ملتا ہے، خواجہ فرید نے خودی کو اِسی معنی میں اور اِسی ہی املاء میں استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ کریں:

آہن قلندر روز و شب
پہنجی خودی میں خود غرق[۲۰]

(صوفیا صبح شام اپنی خودی میں مستغرق رہتے ہیں۔)

یہ استغراق صوفی کو جذب دروں سے نصیب ہوتا ہے۔ اسی حوالے سے اقبال کہتے ہیں:

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر اک بوند پانی میں بند[۲۱]

علامہ اقبال اور خواجہ غلام فرید کے نظریۂ خودی کے فکری نقطۂ نظر میں بنیادی اشتراک ہے، لیکن تفہیم کے لحاظ سے دونوں کے مزاج انفرادی حیثیت کے حامل ہیں۔

خواجہ غلام فرید کی خودی باطنی زندگی اور روحانی تجربات میں تحلیل ہو جاتی ہے، جب کہ اقبال کی خودی اس سے مختلف ہے جو اپنی انفرادیت قائم رکھتی ہے۔ خواجہ غلام فرید کی خودی فناء فی اللہ اور وحدت الوجودی تجربے سے مظاہر کا ادراک کرتی ہے جب کہ علامہ اقبال کی خودی تحریک سے باعزت پروان چڑھتی ہے اور ذات میں کائنات کو تسخیر کر لینے کا ہنر رکھتی ہے۔ سمندر ایک بوند پانی میں بند ایک علامتی مظہر ہے اصل خودی لامحدود ذات اور کائنات میں مخفی ہے۔ خواجہ غلام فرید کے یہاں خودی کا بنیادی تصور صوفیانہ روحانی جذب ہے جب کہ اقبال کے یہاں خودی صوفیانہ تجربہ، قوتِ عمل اور عرفانِ ذات پر مشتمل ہے۔ انائے مقید اپنے وجود میں انائے مطلق کی طرف کشش رکھتی ہے، خودی محدود صوفیاء کے ہاں فناء فی اللہ کی طرف رغبت رکھتی ہے۔

علامہ اقبال اور خواجہ غلام فرید کے متصوفانہ مشترکہ موضوعات میں خودی، عشق، فلسفۂ حیات، فقر، غیور، وجودِ مطلق، زمان و مکان، روزِ ازل، عرفانِ ذات، جبر و قدر، آخرت اور مُلّا پر مباحث کا اشتراک موجود ہے۔

اس کے علاوہ اقبال اور خواجہ غلام فرید کے متصوفانہ نظریات میں ہم آہنگی ہے:

- علامہ اقبال فقرِ مخمور و مسکور اور فقرِ مجبور و مقہور سے ساری زندگی کنارہ کش رہے، اور فقرِ غیور اور فقرِ جسور کی حمایت میں رہے۔
- خواجہ غلام فرید بھی مردم آزار تصوف سے بیزار تھے، لیکن سرشار و پُر کیف تصوف کے حامی تھے۔

اتنی مماثلت کے باوجود ایک ہلکا سا تفاوت بھی موجود ہے۔ یہ تفاوت سکر آلود تصوف کی وجہ سے ہے۔ ایسا مضمحل اور خمار آلود تصوف ان دونوں کے صوفیانہ نظریات میں افتراق کا باعث بنتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خواجہ فرید، دیوانِ فرید، مرتبہ: جاوید چانڈیو (بہاول پور: سرائیکی ادبی مجلس، ۱۹۹۸ء)، ۱۲۱۔

۲۔ محمد اقبال، بال جبریل (لاہور: شیخ غلام محمد اینڈ سنز، ۱۹۳۵ء)، ۱۰۱۔

۳۔ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، مترجمہ: پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی (لاہور: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۳ء)، ۵۰۲۔

۴۔ خواجہ فرید، دیوانِ فرید، مرتبہ: جاوید چانڈیو، ۱۱۸۔

۵۔ ایضاً، ۱۱۰۔

۶۔ علامہ اقبال، ضرب کلیم، مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ۹۵۔

۷۔ خواجہ فرید، دیوانِ فرید، مرتبہ: جاوید چانڈیو، ۲۵۲۔

۸۔ میاں اختر فریدی، "خواجہ فرید اور احترام انسانیت اور رواداری"، مشمولہ: ماہنامہ تذکار ملتان، جلد ۴، فروری ۲۰۰۸ء، ۷۔

۹۔ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، مترجمہ: پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی، ۵۴۔

۱۰۔ خواجہ فرید، دیوانِ فرید، مرتبہ: جاوید چانڈیو، ۲۴۳۔

۱۱۔ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، مترجمہ: پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی، ۸۸۶۔

۱۲۔ خواجہ فرید، دیوانِ فرید، مرتبہ: جاوید چانڈیو، ۱۱۰۔

۱۳۔ ایضاً، ۱۶۴۔

۱۴۔ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، مترجمہ: پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی، ۹۸۳۔

۱۵۔ محمد خالد مسعود، اٹھارویں صدی عیسوی میں برصغیر میں اسلامی فکر کے رہنما (اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ۲۰۰۸ء)، ۳۳۵۔

۱۶۔ خواجہ فرید، دیوانِ فرید، مرتبہ: جاوید چانڈیو، ۱۶۳۔

۱۷۔ ابوالقاسم قشیری، رسالہ قشیریہ، مترجمہ: ڈاکٹر پیر حسن (اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ۲۰۰۸ء)، ۲۶۱۔

۱۸۔ محمد اسلم مبتلا، فرید نامہ (رحیم یار خان: کمپوزنگ لیب، کچہری روڈ، ۱۹۹۹ء)، ۶۴۔

۱۹۔ محمد اسلم مبتلا، فرید نامہ (ملتان: بزمِ ثقافت، مائی مہربان، چوک فوارہ، ۱۹۹۹ء)، ۲۷۰۔

۲۰۔ خواجہ فرید، دیوانِ خواجہ فرید، مرتبہ: خواجہ طاہر محمود کوریجہ (لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۰۲ء)، ۳۱۲۔

۲۱۔ محمد اقبال، بال جبریل، ۲۰۷۔